محمد جعفر شاہ پھلواروی

اسلام کا مقصد حصولِ حکومت ہے یا مثالی معاشرہ

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ قیامِ حکومت اسلام کا کوئی مقصد نہیں بلکہ یہ محض ایک ناگزیر ذریعہ ہے ایک دوسرے بلند مقصد کا۔ اور وہ بلند مقصد ایک مثالی معاشرے کا قیام ہے۔ بحث کو معاشرے تک ہی محدود رکھا گیا ہے ورنہ معاشرہ خود بھی ایک ذریعہ ہے تکمیلِ فرد کا۔ فرد اور معاشرہ ایک دوسرے سے کچھ ایسے پیوستہ ہیں کہ ان کو باہم جدا کرنا مشکل ہے۔ معاشرے کی مثالی زندگی ہے۔ وہاں کوئی نظامِ حکمرانی اور حاکم و محکوم کا فرق نہ ہوگا۔ مگر معاشرہ ایک خاص انداز کا وہاں بھی ہوگا۔

قرآن کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ بطور نصب العین کے کوئی حکومت قائم کرنا نہیں چاہتا بلکہ اسلام کا مقصد ایک ایسا صالح معاشرہ قائم کرنا ہے جس میں حکومت و سیاست کا دباؤ کم سے کم تر ہوتا چلا جائے۔ یہاں تک کہ حکومت کا وجود معاشرے میں اس طرح تحلیل ہو جائے کہ ہر فرد صرف اپنے اخلاقی تقاضے سے اپنی رضا کارانہ خوش دلی کے ساتھ فرائضِ معاشرہ کو ادا کرتا رہے اور طاعتِ الٰہی میں اس کے اور خدا کے درمیان کوئی واسطہ نہ سیاسی ہو نہ روحانی یعنی نہ ملوکیت ہو نہ پیشوائیت۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کئی سوالات کو پہلے حل کرنا پڑے گا:

۱۔ اس دعوے کا کیا ثبوت ہے کہ قرآن قیامِ حکومت کا طالب نہیں اور وہ صرف مزاجِ معاشرہ چاہتا ہے؟

۲۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کسی دور میں انسان حکومت کی ضرورت سے بے نیاز ہو جائے؟

۳۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اسلام کا مقصد کوئی حکومت کرنا نہیں تو اس سے کیا حاصل؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ ہمیں قرآن پاک میں کوئی ایسی آیت نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو کہ اسلام کوئی خاص طرز کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ کسی پیغمبر کی زبان سے کوئی ایسا جملہ ہماری نظر سے نہیں گزرا کہ "میں ایک عمدہ نظامِ حکومت قائم کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں یا مجھے خدا نے اسی مقصد کے لئے بھیجا ہے"۔ مکّے کے تیرہ سال کی نبوی زندگی کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے لیکن ایک موقع بھی ایسا نظر نہیں آتا جہاں حضور اکرم نے یہ فرمایا ہو کہ "میرا مقصد کوئی اعلیٰ اور صالح حکومت قائم کرنا ہے"۔ حضور کا جو اقتدار مکّی زندگی میں نیز مدنی زندگی میں بلکہ وفات کے بعد بھی آج تک قائم ہے اس کے لئے "حکومت" کا لفظ اتنا ہی گھٹیا اور ذلیل ہے جتنا قرآن مجید کے لئے کتابِ آئین کا لفظ۔ ذرا آئیے ایک سرسری نظر سے ان دونوں ـــــ پیغمبر اور اہلِ حکومت کے اقتدار ـــــ کے فرق کا موازنہ کرتے چلیں۔

(۱) حکومت کا اقتدار بے انتہا تنگ ہوتا ہے۔ اس کا دائرۂ اثر صرف ظاہری جسم کے خول پر ہوتا ہے اور وہ بھی اسی جگہ جو اس کے علم میں آجائے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک سیاسی دباؤ سے انسان کی زبان چپ رہتی ہے لیکن اس کا دل گالیاں اور بددعائیں دیتا رہتا ہے۔ اس کے دل میں صاحبِ حکومت کی طرف سے شدید نفرت ہوتی ہے اور دل میں یہ آرزو موجزن ہوتی ہے کہ موقع ملے تو اس کا تختہ اُلٹ دیا جائے اور شدید قسم کا انتقام لے لیا جائے۔ لیکن پیغمبر کا اقتدار و قبضہ اہلِ ایمان کے جسم پر، روح پر، دل پر، دماغ پر، جلوت میں، خلوت میں، سوتے، جاگتے، حرکت میں، سکون میں، افکار پر، گفتار پر، کردار پر غرض ساری زندگی اور زندگی کے تمام گوشوں پر ہوتا ہے۔

(۲) حکومت سے اگر پولیس اور فوج وغیرہ کو ایک سیکنڈ کے لئے ہٹا لیا جائے تو حکومت محض ایک لفظ رہ جاتا ہے جو شرمندۂ معنی نہیں ہوتا۔ لیکن پیغمبری اقتدار ان تمام چیزوں سے بے نیاز اور بالاتر ہوتا ہے۔ یہاں یہ ہوتا ہے کہ مجرم اپنا جرم چھپاتا اور بھاگتا پھرتا ہے اور وہاں کسی سی آئی ڈی اور پولیس کے بغیر مجرم خود آکر سزا و تطہیر پر اصرار کرتا ہے۔

(۳) وہاں اقتدار کا مظاہرہ دولت و امارت، شان و شوکت، وغیرہ سے ہوتا ہے اور یہاں درویشی و فقر، سادگی و قناعت کا لافانی اقتدار ہوتا ہے۔ فتح مکہ کے دن ابوسفیان نے دیکھا کہ حضور وضو فرماتے ہیں تو لوگ غسالۂ وضو اپنے چہروں پر ملنے کو ٹوٹے پڑتے ہیں۔ یہ محبوبیت و شوکت دیکھ کر ابوسفیان نے حضرت عباس سے کہا:

یا ابا الفضل لقد اصبح ملک ابن اخیک عظیما۔

اے عباس تمہارے برادر زادے کا بادشاہانہ اقتدار تو بڑا زبردست ہے

عباس نے جواب دیا:

لیس بملک ولکنها النبوة

(ارے بے وقوف) یہ بادشاہت نہیں نبوت ہے۔ (رواہ الطبرانی عن میمونہ)

جناب عباس نے ایک ایسی سچی حقیقت بتائی ہے جو ہماری تمام گفتگو کا عطر اور ہمارے سارے دعوے کی جان ہے۔ اس کے بعد کسی تشریح کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ واقعہ یہ ہے کہ محض حکومت خواہ کسی قسم کی ہو اس کی سرحدیں بادشاہت سے زیادہ دور نہیں ہوتیں۔ حکومت خواہ کسی تنہا انسان کی — ملوکیت یا آمریت — کی شکل میں ہو یا عوام کے نمائندوں کی — جمہوریہ کی — شکل و صورت رکھتی ہو، وہ بہرحال ایک فرد یا چند افراد ہی کی حکومت کا دوسرا نام ہے یعنی ایک طبقہ حاکم اور دوسرا محکوم ہوتا ہے لیکن نبوت کا پیغام اس سے سراسر مختلف ہے۔ نبوت ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتی ہے جس میں نہ کوئی کسی کا محکوم ہو نہ حاکم۔ علامہ اقبال نے اس الٰہی نظامِ معاشرہ کا نقشہ بڑی خوبی سے ان الفاظ میں کھینچا ہے

کس دریں جا سائل و محروم نیست　　عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

خدمت آمد مقصد علم و ہنر　　کار ہا را کس نمی سنجد بہ زر

کس ز دینار و درم آگاہ نیست — ایں بتاں را در حرم ہا راہ نیست

اقبال کا کہنا یہ ہے کہ ہر نظامِ حکومت میں معاشی نظام یہ ہوتا ہے کہ ایک طبقہ دینے والا اور دوسرا لینے والا، ایک غنی اور دوسرا محتاج ہوتا ہے لیکن الٰہی نظامِ معاشرہ میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوتا اور اس معاشی مساوات کے بعد سیاسی حاکمیت و محکومیت اور معاشری آقائی و غلامی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اور یہاں جس طرح مالی سرمایہ داری نہیں ہوتی اسی طرح علمی سرمایہ داری کا وجود بھی نہیں ہوتا چونکہ اس کا نتیجہ بھی آخر وہی اکتنازِ سیم و زر ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں درہم و دینار محض مبادلۂ اجناس کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ بُت بن کر خدائی نہیں کرتا۔ دنیا کی کوئی حکومت ایسی نہیں جو سیم و زر کی خداوندی پر قائم نہ ہو۔ یہ صرف اسلامی نظامِ معاشرہ ہے جو سب سے پہلے اسی بُت کو پاش پاش کرتا ہے۔ اس کے ٹکڑے اڑانے کے بعد پھر اور کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہ سکتی جو اپنی خداوندی قائم کر کے اولادِ آدم کو حاکم و محکوم کے دو طبقوں میں بانٹ سکے۔

(۴) حکومت اور اسلامی نظامِ معاشرہ میں ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ وہاں غالب عنصر ہیبت اور دباؤ کا ہوتا ہے اور یہاں محبت، عقیدت، عظمت، خوشدلانہ طاعت اور رضاکارانہ اتباع کا ایسا حسین امتزاج ہوتا ہے جو معاشرے کو ایک سدا بہار گلدستہ بنا دیتا ہے۔

(۵) وہاں قانون و سیاست کی خشکی کو اوّلیت حاصل ہوتی ہے اور یہاں ساری بنیاد اخلاقی اقدار پر رکھی جاتی ہے۔

(۶) وہاں مذہب کو اقتدار کا بہانہ بنا لیا جاتا ہے اور یہاں اقتدار صرف تقویتِ دین کے لئے وقف ہوتا ہے۔

(۷) وہاں اہلِ حکومت انسانوں کے آقا ہوتے ہیں اور یہاں امیر کی حیثیت بھی ایک خدمت گزار بھائی سے زیادہ نہیں ہوتی۔ (اور یہ امارت بھی خود کوئی مقصود نہیں ہوتی)

(۸) وہاں انسانی اقتدار ہوتا ہے اور یہاں اقدار کا اقتدار ہوتا ہے۔

(۹) وہاں نری عقل و سیاست ہے اور یہاں عشق کی پیدا کردہ عقل ہے۔ رومی نے سچ کہا ہے ؎

عقل زابلیست و عشق از آدم ست — می شناسد ہر کہ از سر محرم ست

(۱۰) وہاں خالص قاہری ہے اور یہاں دلبری کی راہ سے آنے والی قاہری ہے۔

غرض اسلامی نظامِ معاشرہ اور انسانی نظامِ حکومت میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ حکومت جیسی گھٹیا چیز کبھی اسلام کا مقصود نہیں بن سکتی۔ اسی لئے نہ قرآن نے اسے اپنا مقصد بنایا نہ کسی رسول نے۔ کسی پیغمبر نے کوئی عمدہ و اعلیٰ نظامِ حکومت قائم کرنے کی دعوت نہیں دی۔ پیغمبر صرف اپنی اپنی انفرادی و اجتماعی اصلاحِ حال کی دعوت دیتا ہے۔ کجا حکومت کی عیاریاں اور کجا اسلامی نظامِ معاشرہ کی ایمانداریاں۔ شتان بینھما۔ ممکن نہیں کہ کسی فرد یا قوم کا مقصد حکومت ہو اور وہ اس کے لئے ہر ممکن شیطنت و ابلیسیت کو کام میں نہ لائے۔ نظامِ حکومت کے معنی ہیں انسانوں

کو دو طبقوں — حاکم و محکوم — میں منقسم کر دینا اور اس تقسیم کو قائم رکھنے کے لئے اخلاق سے کہیں زیادہ قاہرانہ و جابرانہ دباؤ، سیاسی عیاریوں، ظالمانہ چالبازیوں، ابلیسی سازشوں اور شیطانی فریب کاریوں کو کام میں لانا پڑتا ہے۔ اس کے نزدیک عدل، انصاف، انسانیت، اخلاقی اقدار بے معنی الفاظ ہوتے ہیں۔ ان اوصاف حمیدہ کو اگر حکومت باقی رکھتی ہے تو ان اوصاف کی خاطر نہیں بلکہ صرف اس لئے اور اسی حد تک کہ حکومت کا استحکام قائم رہے۔ اسلام اس طبقاتی تقسیم کو اور اس کی خاطر ان انسانیت کُش عیاریوں کو کب روا رکھ سکتا ہے جو حکومت کا لازمی نتیجہ ہیں۔

یہاں ایک زبردست شبہ یہ پیدا ہوگا کہ عملی اسلام کے بہترین دور — عہدِ نبوت اور عہدِ خلفائے راشدین — میں بہرحال ایک "اندازِ حکومت" موجود تھا۔ پس جب خیر القرون میں حکومت سے مفر نہ ہو سکا تو بعد کے کسی دور کے متعلق یہ توقع کب کی جا سکتی ہے کہ وہ حکومت کی ضرورت سے بے نیاز ہو سکے گا؟

یہ سوال بلاشبہ دل میں کھٹک پیدا کر سکتا ہے لیکن اس سے ہمارے اصل دعوے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خیر القرون میں کسی بات کا پایا جانا اور چیز ہے اور اس بات کا مقصود ہونا اور شے ہے۔ خیر القرون میں کئی ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جو بذاتِ خود مقصود نہیں۔ اس وقت ان باتوں کا پایا جانا یقیناً ناگزیر تھا۔ وہ خیر القرون اس لئے ہے کہ اُن حالات میں اس سے بہتر معاشرہ نہ کبھی قائم ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود وہاں کئی چیزیں ایسی موجود تھیں جن کا موجود ہونا ناگزیر تھا لیکن وہ مقصود نہ تھیں۔ ان چیزوں کو اس نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہئے کہ وہ چیزیں موجود تھیں۔ ان کو اس نقطۂ نظر سے دیکھئے کہ ان کا رُخ کس مقصد کی طرف مڑا ہوا تھا؟ آیا وہ چیزیں اس لئے اختیار کی گئی تھیں کہ وہ بذاتِ خود مقصود تھیں یا اس لئے کہ عبوری طور پر انہیں اختیار کرنا ناگزیر تھا اور مقصود کچھ اور تھا؟ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے چند مثالوں پر غور کیجئے جو ہم کئی مواقع پر پیش کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

(۱) قرآن نے کئی جگہ لونڈی غلام کے متعلق احکام دئے ہیں لیکن ان کا مقصد غلامی کی توثیق نہیں بلکہ مقصد ایسا نظامِ معاشرہ تعمیر کرنا ہے جس میں غلامی کی رسم ہی ختم ہو جائے اور تمام انسان یکساں آزادی کی سانس لیں۔

(۲) قرآن نے محتاجوں اور سائلوں کی اعانت پر بار بار اُبھارا ہے لیکن اس کی غرض یہ نہیں کہ دنیا میں ہمیشہ بھیک مانگنے والوں کا ایک طبقہ ضرور موجود رہے تاکہ ان کی مدد کا ثواب لُوٹا جایا کرے۔ بلکہ اس سے غرض ہی ایسا معاشی نظام بنانا ہے جس سے محتاجی دور ہو جائے اور کوئی کسی کا دست نگر نہ رہے ۔؎

نے بہ بازاراں ز بیکاراں خروش — نے صدا ہائے گدایاں در دگوش

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس — نکتۂ شرعِ مبیں ایں ست و بس (اقبال)

(۳) قرآن نے متعدد جرائم کے لئے سزائیں بتائی ہیں لیکن ان کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ دنیا میں ہمیشہ وہ جرم ہوتے رہیں تاکہ سزائیں دے دے کر قرآنی حکم پورا ہوتا رہے بلکہ اس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ معاشرے سے جرائم کا خاتمہ

ہو جائے اور تعزیر و حدود کا قانون بے کار ہو جائے۔

(۴) قرآن بار بار قتال و جنگ پر اُبھارتا ہے لیکن اس کا اصلی مقصد اس کے بالکل برعکس ہے یعنی آخر کار وہ ایسا نظامِ امن قائم کرنا چاہتا ہے کہ جنگ کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے ؎

اندراں عالم نہ لشکر نے قشوں نے کسے روزی خور و از کشت و خوں

(۵) قرآن نے طلاق کے متعلق بھی احکام دئے ہیں لیکن ان سے مقصود طلاقوں کو رواج دینا نہیں بلکہ اسے ختم کرنا ہے۔

(۶) قرآن نے وراثت کے بھی احکام دئے ہیں لیکن اس سے مقصد جاگیرداری کی توثیق یا بقا نہیں بلکہ اسے دوسری تیسری ہی پُشت میں تدریجاً اس طرح ختم کر دینا کہ آخر میں ضرورت ہی نہ رہ جائے۔

ان چند مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ قرآن کے بہت سے احکام ایسے ہیں جو اپنے اصلی مقصد کے ہم شکل نہیں بلکہ گویا نقیض ہیں اور علاج بالضد کی طرح ناگزیر علتیں ہیں جو اگرچہ مجبوراً اختیار کرنی پڑتی ہیں لیکن خود مقصود نہیں ہوتیں۔

اس کے بعد یہ بات بھی آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ قرآن نے امیر و مامور کے متعلق بھی احکام دئیے ہیں اور خیر القرون میں بھی نظامِ امارت موجود تھا لیکن منتہائے مقصود کسی سیاسی و قانونی استبداد کا نظامِ حکومت قائم کرنا نہیں بلکہ وہ اس راہ سے ایک ایسا "لا ریاست" صالح معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں نہ کوئی حاکم ہو نہ محکوم بلکہ ہر شخص اتنی بلندی پر پہنچ جائے کہ کسی روحانی و سیاسی (پیشوائی و حکومتی) واسطے کے بغیر براہِ راست طاعت الٰہی کرتا رہے۔ یہ تجربہ ہر روز ہمارے گھروں میں بھی ہوتا رہتا ہے۔ ہم بچوں پر اپنی حکومت ہی قائم کرتے ہیں۔ بہت سے ایسے کام جن کے فلسفے کو وہ نہیں سمجھ سکتا اسے ڈانٹ ڈپٹ کر دھمکیاں دے کر، دباؤ ڈال کر کرا لیتے ہیں لیکن یہ جبر و اکراہ محض عارضی، وقتی اور عبوری ہوتا ہے۔ ہمیشہ قائم رہنے کے لئے نہیں۔ اسے اس راہ سے ایک ایسے مقام پر لے جانا ہوتا ہے جہاں اسے خود سمجھ آ جائے اور وہ کام کسی دباؤ کے بغیر ہی کرنے لگے۔ بالکل یہی شکل معاشرے کی ہوتی ہے۔ معاشرے سے جو کام بھی حکومتی دباؤ ڈال کر لیا جاتا ہے وہ ایک عبوری اور ناگزیر ذریعہ ہوتا ہے۔ اس حکومتی دباؤ کو کوئی دائمی مقصد سمجھ لینا صحیح نہیں، اس ناگزیر دباؤ کے ذریعے سے کاروانِ انسانیت کو ایک ایسی منزل پر لے جانا ہے جہاں یہ دباؤ ختم ہو جائے۔ بلاشبہ یہ منزل دور ہے، بہت دور۔ مگر مقصد اور نصب العین یہی ہونا چاہیئے۔

یہیں سے دوسرے سوال کا جواب شروع ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا کبھی انسان پر ایسا دَور آنا بھی ممکن ہے کہ وہ حکومت سے بے نیاز ہو جائے؟ بلکہ تیسرے سوال کا جواب بھی اسی میں آ جاتا ہے جو یہ ہے کہ یہ تسلیم کرنے سے کہ اسلام کا مقصد حکومت نہیں کون سا فائدہ ہے؟

بات یہ ہے کہ مثالی معاشرہ ایک نصب العین ہے۔ نصب العین نام ہی اس حقیقت کا ہے جو کبھی حاصل نہ ہو۔ یہ افق کی طرح ہمیشہ نظر کے سامنے آگے آگے رہتا ہے اور اسے ایسا ہی ہونا بھی چاہئے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ فطرت ارتقاء پذیر ہے۔ ساری کائنات میں ارتقاء جاری ہے۔ ہر شے ایک نصب العین کی طرف بے ساختہ بڑھتی اور کھنچتی چلی جا رہی ہے۔ اسے کسی مقام پر ٹھہراؤ نہیں۔ اگر نصب العین حاصل ہو جائے تو وہیں ٹھہراؤ پیدا ہو جائے گا اور ارتقاء ختم ہو جائے گا۔ قدرت نے اس کائنات کا نظام ہی کچھ ایسا بنایا ہے کہ نصب العین حاصل تو نہیں ہوا کرتا مگر نصب العین متعین کئے بغیر کام بھی نہیں چل سکتا۔ گویا نصب العین یہ رہ جاتا ہے کہ ایک ایسے نصب العین کی طرف بڑھتے چلے جاؤ جو کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ غالب نے اس حقیقت کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے کہ ؎

گفتمش: ذرّہ بخورشید رسد؟ گفت: محال
گفتمش: کوششِ من طلبش؟ گفت: رواست

ذرّہ خورشید تک پہنچ تو نہیں سکتا لیکن اس کا کام یہی ہے کہ خورشید تک پہنچنے کی کوشش میں اپنی زندگی ختم کر دے۔ رومی نے اسے دوسرے انداز سے یوں ادا کیا ہے ؎

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

تم کہتے ہو کہ مقصود حاصل نہیں ہوتا اور میرا مقصود ہی وہ ہے جو حاصل نہ ہو سکے۔

سقراط نے کہا ہے کہ "نقطے کا وجود محض ذہنی ہے۔ خارج میں کوئی ایسی چیز نہیں پائی جا سکتی جس پر نقطے کی تعریف صادق آ سکے یعنی اس میں نہ طول ہو نہ عرض ہو نہ عمق ہو لیکن جب تک نقطے کو تسلیم نہ کیا جائے اس وقت تک خارج میں کوئی اقلیدسی کام چل ہی نہیں سکتا۔ جسم کا طول (بلا عرض و عمق) ہے خط اور خط کا صرف متعین کنارہ (بلا طول و عرض و عمق) نقطہ ہے یعنی نقطے کا حصول ممکن ہی نہیں لیکن اسے مانے بغیر نہ خط بنتا ہے نہ سطح نہ اقلیدسی شکلیں اور نہ جسم۔ یہی صورت نصب العین کی ہے کہ اسے مقصد بنانا پڑے گا جس کا حصول تو ممکن نہیں۔ لیکن اس کے بغیر کوئی جد و جہد ہی ناممکن ہے۔ سب سے بڑا اور اصل نصب العین خدا ہے۔ اس کا عرفان و عبادت ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلعم جیسے بندۂ خدا کو بھی یہی کہنا پڑا کہ: ما عبدناک حق عبادتک وما عرفناک حق معرفتک۔

جیسی عبادت اور جیسا عرفان چاہئے تھا وہ مجھ سے بھی ادا نہ ہو سکا

پس جس مثالی معاشرے کا ذکر اوپر ہوا ہے ـــــ جس میں حکومت کا کوئی وجود نہ رہے وہ بے شک ممکن الحصول نہ ہو لیکن نصب العین وہی رہے گا۔ آئیڈیل وہی معاشرہ ہے جو پوری طرح حاصل نہ ہو سکے لیکن نگاہ اسی پر جمی رہے اور ارتقاء اسی کی طرف ہوتا رہے۔ اگر ایسا معاشرہ حاصل ہو جائے تو ارتقاء وہیں ختم ہو جائے گا اور جو چیز ارتقا کو ختم

کردے وہ نصب العین نہیں بن سکتی۔ زندگی کا بڑا مقصد جنت کا حصول ہے لیکن ایسا قرار وہاں بھی نہیں جو ارتقاء کو ختم کرسکے۔ وہاں کی زندگی کے متعلق بھی قرآنی ارشاد یہی ہے کہ :

لھم درجات عند ربھم۔ درجات کا لامتناہی ارتقاء وہاں بھی ہے۔

پس یہ سوال ہی بے معنی ہے کہ "کیا انسان پر کوئی ایسا دور بھی آسکتا ہے جب اسے حکومت کی ضرورت نہ رہے؟ ایسا دور آئے یا نہ آئے لیکن نصب العین یہی رہے گا اور اسی بلند مقصد کی طرف معاشرتی نظام کا رُخ رکھا جائیگا۔ نصب العین اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ حاصل کیا جائے بلکہ اس لئے ہوتا ہے کہ اس کے حصول کی کوشش میں ساری قوتیں صرف کی جاتی رہیں۔ نصب العین حاصل تو نہیں ہوتا لیکن اس کا قرب زیادہ سے زیادہ حاصل ہوتا ہے اور اس سے ملتی جلتی نعمت اور اس سے ہم رنگی کی دولت حاصل ہوجاتی ہے۔ جسے ہم تقرب یا تخلق کہہ سکتے ہیں۔ پھر اس تقرب و تخلق میں بھی لاانتہا درجات ہیں۔ ہر تقرب کے آگے ایک اور تقرب اور ہر تخلق کے بعد ایک اور بلند تر تخلق کا مقام ہے۔ بس اسی طرح ارتقا کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ غرض نصب العین قیام حکومت نہیں بلکہ اختتام حکومت ہے۔

یہ صحیح ہے کہ آج تک ہر زمانے میں کسی نہ کسی شکل میں حکومت کا وجود رہا ہے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ اس کے باوجود ہمارا دعویٰ اپنی جگہ قائم ہے۔ شر کا وجود بھی ہمیشہ رہا ہے اور انسان کبھی اس سے بے تعلق نہیں رہ سکا بلکہ اس کا وجود اتنا ضروری ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو خیر کا وجود بھی ناممکن ہے۔ لیکن بہرحال نصب العین خیر ہی رہیگا۔ شر ضروری ہونے کے باوجود کبھی مقصد نہیں بن سکتا۔ دنیا میں کفر بھی ہمیشہ سے قائم ہے اور ہمیشہ رہے گا اور اس کے بغیر اسلام کی شناخت ناممکن ہے۔ اس کے باوجود مقصد اسلام ہی ہوگا، کفر نہیں ہوگا۔ اسی طرح حکومت کا وجود بھی ایک شر ہے ـــــ ناگزیر شر ـــــ اور ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا لیکن اس کے باوجود یہ مقصد نہیں۔ یہ تو صرف ایک ایسا شر ہے جو کسی بڑے شر کو دور کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔

یہ بھی ٹھیک ہے کہ اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ کام تو روپے کے بغیر بھی نہیں چل سکتا لیکن کون دعوے کرسکتا ہے کہ روپیہ کوئی نصب العین یا مقصد ہے۔ روپے سے زکوٰۃ دی جاتی ہے، حج کیا جاتا ہے، مساجد تعمیر کی جاتی ہیں، جہاد کیا جاتا ہے۔ کون سی نیکی ہے جو روپے سے نہیں ہوتی؟ اس کے باوجود روپیہ کوئی مقصد نہیں۔ اور اگر یہی مقصد بن جائے تو اس سے بڑا دنیا میں کوئی شر نہیں۔ قرآن اس کی مذمت سے بھرا پڑا ہے۔

اس کے بعد تیسرے سوال کو لیجئے کہ اگر یہ نظریہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ اسلام کا مقصد قیام حکومت نہیں تو اس سے فائدہ کیا ہے؟ فائدہ صرف یہ ہے ایک صحیح نصب العین سے انسان کا زاویۂ نظر ہی بدل جاتا ہے اور اس سے پوری زندگی اور پورا معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔ زندگی اور معاشرے کا سارا نظام زاویۂ نگاہ ہی کے بل بوتے پر چلتا ہے۔ اگر انسان جنگ کو مقصد بنالے تو ہر حیلے بہانے سے جنگ چھیڑا کرے گا اور اگر مقصد جنگ کو ختم کرکے ایسا نظام امن قائم کرنا ہو جسمیں

جنگ کا نام ونشان ہی مٹ جائے تو اس زاویۂ نظر کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ:

۱۔ انسان جنگ کو جہاں تک ٹال سکتا ہے ٹالے گا۔

۲۔ صرف وہیں جنگ کرے گا جہاں یہ ہر لحاظ سے ناگزیر ہو۔

۳۔ اتنی ہی جنگ کرے گا جتنی ضروری ہو۔

۴۔ اگر جنگ کے بغیر مطلوبہ امن قائم ہوسکے تو وہ جنگ نہیں کرے گا۔

۵۔ اس کی کوشش یہ ہوگی جنگ کی مقدار کم سے کم ہو اور امن کا فائدہ زیادہ سے زیادہ حاصل ہو۔

۶۔ ہر پیش آنے والی جنگ میں یہ زاویۂ نگاہ گزشتہ جنگ کی بہ نسبت زیادہ ترقی یافتہ ہوتا جائے گا۔

۷۔ اگر جنگ کرنے اور نہ کرنے دونوں میں نقصان ہو تو اس نقصان کو جو ترک جنگ سے ہوسکتا ہے اس نقصان پر ترجیح دے گا جو جنگ کے بعد متوقع ہو۔

غرض زاویۂ نظر کی تبدیلی سے پورے نظامِ زندگی کا رُخ بدل جائے گا۔ یہی صورت رسمِ غلامی، تعزیرات، امانتِ مساکین، قانونِ طلاق، حقِ ملکیت وغیرہ کی ہے جن کا ہم اوپر ذکر کرچکے ہیں کہ یہ ذرائع ووسائل ہیں، مقصود نہیں۔

یوں ہی سمجھئے کہ حکومت محض ایک ناگزیر ذریعہ ہے حکومت کے وجود کو ختم کرنے کا۔ یہ خود مقصود نہیں صرف وسیلہ وذریعہ ہے۔ اگر اسے ذریعے کی بجائے مقصود تصوّر کیا جائے گا تو لازماً اس زاویۂ نظر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ:

(۱) اخلاقی قدریں خواہ کسی قدر پامال ہوں اس کی کوئی پرواہ نہ ہوگی۔ پرواہ صرف بقائے حکومت کی ہوگی خواہ اس کی بقا کے لئے کچھ بھی کرنا پڑے۔

(۲) حکومت کے استعمال میں کبھی عدل واعتدال نہ باقی رہ سکے گا۔ صاحب حکومت کی ہر حال میں یہی کوشش ہوگی کہ حکومت کی مستبدانہ گرفت زیادہ سے زیادہ مضبوط ہوتی چلی جائے خواہ نتیجۃً حاکم ومحکوم کی خلیج بڑھتی کیوں نہ جائے۔

(۳) انسان ہمیشہ حاکم ومحکوم کے دو طبقوں میں منقسم رہیں گے اور کبھی ان میں مساوات نہ پیدا ہوگی۔

(۴) جذبۂ حکومت کبھی قانع نہ ہوگا اور ہوسِ ملک گیری بڑھتی چلی جائے گی جس سے دنیا میں امن چین نہ قائم ہو سکے گا۔

غرض یہی کچھ ہوگا جو لازمی نتیجہ ہے اس زاویۂ نگاہ کا۔ اور حکومتوں کی پوری تاریخ ان ہی نکات کی تفسیر ہے۔ بعض اوقات تو یہ ہوتا ہے کہ جذبۂ حکومت کا آغاز بڑا معصوم ہوتا ہے اور ابتدائی ارادہ یہ ہوتا ہے کہ صالح اور عادلانہ حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ اور اپنی نہیں بلکہ خدا کی حکومت قائم کی جائے گی۔ لیکن اقتدارِ حکومت ہاتھ میں آنے کے بعد اس کا نشہ سوار ہونے لگتا ہے۔ فرعونیت جڑ پکڑنے لگتی ہے۔ پھر ظلم واستبداد، اخلاقی اقدار کی پامالی، عیاری وشیطنت، سازش وکیادی، غرور وتمکنت اور عیش وطرب دماغ میں سمانا شروع ہو جاتا ہے اور عقلِ حیلہ گر ہر فعل کے جواز کے لئے ایک

منطقی استدلال و توجیہ تلاش کر لیتی ہے۔ ابتدا میں زبان پر خدا کی حکومت ہوتی ہے، اسلام اور قرآن کا نظامِ حکومت ہوتا ہے لیکن تحت الشعور میں اپنی حکومت کا جو شیطانی جذبہ پنہاں ہوتا ہے وہ آخر کار ظاہر ہو کر رہتا ہے۔

عادلانہ حکومت کا تصوّر ابتدا میں ایک پاکدامن اور پارسا "حسینہ" کی طرح ہوتا ہے لیکن اس سے جتنا قرب زیادہ ہوتا جاتا ہے اتنا ہی خطرہ بھی بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک منزل یہ بھی آکر رہتی ہے کہ ؎

لغزشِ مستانہ در رفتار و جامِ مے بکف
رخصت اے تقویٰ کہ یار آمد بہ سامانِ دگر

پھر یہی بھولی بھالی، معصوم، پاکدامن شیشۂ تقوے کو چور چور کر کے رکھ دیتی ہے۔ یہ نشہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

از بسکہ شکستہ باز بستم توبہ — فریاد ہمی کند ز دستم توبہ
دیروز بہ توبۂ شکستم ساغر — امروز بہ ساغرے شکستم توبہ

ایسی خطرناک پاکدامن حسینہ اسلام کا مقصد نہیں بن سکتی۔ اگر مقصد بن سکتا ہے تو اس سے بچنا نہ کہ اس سے وابستہ ہو کر مبتلائے معاصی ہونا۔

لیکن اگر زاویۂ نظر یہ ہو کہ حکومت کوئی مقصود نہیں بلکہ مقصود اسے ختم کرنا ہے تو اس زاویۂ نگاہ کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ:

۱۔ توجہ قیامِ حکومت کی طرف نہ ہوگی بلکہ اصلاحِ معاشرہ کی طرف ہوگی۔
۲۔ اخلاقی اقدار کے قیام کا خیال قیامِ حکومت کے خیال پر مقدم رہے گا۔
۳۔ حاکم و محکوم کی خلیج برائے نام رہ جائے گی۔
۴۔ مساواتِ انسانی کا دور دورہ ہوگا۔
۵۔ حکومتی انداز صرف وہیں استعمال ہوگا جہاں کوئی اور چارۂ کار ہی موجود نہ ہو۔
۶۔ حکومت کے اظہار کی ضرورت کم سے کم ہوگی۔
۷۔ ہر حرکت و سکون کا رُخ اس طرف ہوگا کہ ایک طرف حکومت کا انداز رفتہ رفتہ ختم کیا جائے اور دوسری جانب اسی تناسب سے اخلاقی اقدار کو ترقی دی جائے تاکہ ایک دن حکومت کا وجود اور اس کی ضرورت ختم ہو جائے اور ساری طاعتِ الٰہی کسی قانونی و سیاسی دباؤ کے بغیر رضا کارانہ خوش دلی کے اندرونی جذبے سے ہونے لگے۔

ایک بڑا مغالطہ یہ ہوتا ہے کہ آنحضرت اکرمؐ اور خلفائے راشدین کے ادوار کو ایک نظامِ حکومت تسلیم کرنے کے بعد گفتگو کی جاتی ہے۔ اس دعوے کی دلیل مشکل ہے کہ حضورؐ نے کوئی حکومت قائم فرمائی تھی یا صحابہ کرامؓ نے قیامِ حکومت کو

اسلام مقصد سمجھا تھا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا مقصود ایک اعلیٰ اور صالح نظام معاشرہ تھا۔ حکومت کا تھوڑا سا انداز ایک عبوری مجبوری سے اختیار کیا گیا جو ناگزیر تھا اور چونکہ قیام حکومت مقصد نہ تھا اس لئے ان سب کا رُخ اسی طرف تھا کہ حکومت کو تدریجاً ختم کر دیا جائے اور معاشرے کو ایسے مقام پر لا کھڑا کیا جائے جہاں حکومت بے معنی اور بے ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں حکومت کا اگر کسی مجبوری سے استعمال ناگزیر نظر آیا تو آٹے میں نمک کے برابر یا اس سے بھی کم استعمال کیا اور وہ بھی صرف اس وجہ سے ہوا کہ اصلاح معاشرہ کا کوئی خاص خلا اسکے بغیر پُر نہ ہو سکتا تھا۔ ان کا اصل رجحان اور زاویۂ نظر قیام حکومت نہ تھا بلکہ اسے مٹانا تھا اور ان کی سیرتیں اس پر بہترین گواہ ہیں۔ ان کے نظام امارت کو دیکھ کر یہ سمجھنا کہ یہ کوئی حکومت تھی یا یہی ان کا مقصود تھا ایسا ہی جیسے ان کی کنیزوں اور غلاموں کو دیکھ کر یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ وہ اس ادارۂ غلامی کو مقصود سمجھ کر باقی رکھنا چاہتے تھے۔ یا ان کی تعزیرات کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ جرائم کو جاری رکھنا چاہتے تھے تاکہ قرآنی تعزیرات و حدود کی تکمیل ہوتی رہے وھلم جرّا۔ خلفائے راشدین کی یہ ساری باتیں عبوری تھیں مجبوراً وقتی ضرورت کی تکمیل تھی۔ مقصود ان میں سے کوئی بات بھی نہ تھی۔ پس حکومت بھی ایک ایسی ہی چیز ہے جو نہ اسلام کا مقصود ہے نہ ان کا مقصود تھا۔ اسلام درحقیقت ایک نراج صالح نظام معاشرہ چاہتا ہے اور حکومت کو محض ایک عبوری اور وقتی ضرورت کی تکمیل کے لئے کم سے کم استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ بلاشبہ یہ منزل ابھی بہت دور ہے لیکن نصب العینی حقیقت یہی ہے۔ اس منزل کی دوری کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ اہلِ اسلام نے اسے ایک مقصد بنا لیا ہے۔ وہ جبتک اسے مقصد بنائے رہیں گے منزل مقصود سے دور ہوتے چلے جائیں گے اور (جیسا کہ ہم ساری دنیا میں عموماً اور مسلمانی ممالک میں خصوصاً دیکھ رہے ہیں) اقتدار و حکومت کی جنگ اور کرسیوں کی لڑائی ہر روز شدید سے شدید تر اور پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی چلی جائے گی۔ ان کی ساری قوتیں اور انرجی اسی میں ضائع ہوتی رہے گی اور معاشرے کی کوئی اصلاح نہ ہو گی۔ حکومتوں کے دباؤ سے کبھی کوئی بہتر معاشرہ نہیں بنا ہے، کبھی اخلاقی قدریں نہیں قائم ہوئی ہیں، کبھی روحانی تزکیہ نہیں ہوا ہے۔ یہ تمام کام ان لوگوں نے کئے ہیں جو حکومت کو لعنت سمجھتے رہے ہیں۔ حکومت کا اقتدار اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا کہ چند بدمعاشیوں کو وقتی طور پر علانیہ ظاہر ہونے سے روک دے لیکن اصلاح و تزکیہ کا کام حکومتوں سے کبھی نہیں ہوا ہے۔ مکّی زندگی میں جو افراد اسلام کو ملے ویسے افراد سیاسی اقتدار حاصل ہونے کے بعد کہاں میسر ہوئے؟

یہ عجیب بات ہے کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم محض قوم کی خدمت و اصلاح کے لئے حکومت، وزارت پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ بات بڑی معصومانہ ہے لیکن یہ سب درحقیقت ہوسِ اقتدار کا شیطانی جذبہ ہے جو معصومیت کا غلاف اوڑھ کر زبان پر آتا ہے۔ گویا وزارت و حکومت کے بغیر قوم کی کوئی خدمت ہی نہیں ہو سکتی۔ آپ خود ہی سوچئے کہ جس شخص نے اپنے بے اقتداری کے دور میں کبھی کسی پیاسے کو اُٹھ کر ایک گلاس پانی نہ پلایا ہو کبھی کسی غریب کو بازار سے سودا لا کر نہ دیا ہو، کبھی کسی ضعیف کا بوجھ اپنے کاندھوں پر نہ اُٹھایا ہو..... اس سے یہ توقع کب ہو سکتی ہے کہ اقتدار کی کرسی

پر بیٹھتے ہی ابوبکرؓ و عمرؓ کی طرح خدمت گزار قوم بن جائے گا؟ اگر دنیا کی تاریخ میں اس کی ایک آدھ استثنائی مثال مل سکتی ہے تو ہزار استقرائی نظیریں اس کی ملیں گی کہ بے اقتداری کے اولیاء حصول اقتدار کے بعد شیطان بن گئے۔

انبیاء اور اولیاء میں سب ہی حکومت سے بھاگتے رہے ہیں بلکہ ملتی ہوئی حکومت کو ٹھکراتے رہے ہیں۔ سیدنا موسیٰ لاولد فرعون کے واحد متبنّیٰ تھے۔ ذرا انتظار فرمالیتے تو فرعون کے بعد تختِ حکومت کے تنہا وارث ہوتے۔ لیکن حکومت ملنے کا انتظار نہ فرمایا۔ بلکہ بنی اسرائیل کو لے کر جنگل جنگل مارے پھرے اور حکومت کے ذریعے ان کی تربیت کرنے کی بجائے غربت میں انہیں تربیت دیتے رہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ یوسف و سلیمان علیہما السلام کی نظیریں ہمیں ملتی ہیں جن کے ہاتھ میں خدا نے حکومت کی باگ ڈور دے دی لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حصول حکومت ان کا کوئی مقصود بھی تھا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے مسیح و یحییٰ علیہما السلام نے بے زوج زندگی بسر کی لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ نبوی طریقۂ زندگی میں بے زوج زندگی بسر کرنا بھی داخل ہے۔ نبوّت کی آئیڈیل زندگی جس طرح ازدواجی زندگی گزارنا ہے اسی طرح نظامِ حکومت سے دور رہنا بھی ہے۔

نامناسب نہ ہوگا اگر ہم یہاں چند احادیث نبوی بھی نقل کر دیں۔ ان سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ حکومت کوئی مقصد نہیں۔ یہ ایک ناگزیر علت ہے جہاں تک ممکن ہو اس سے بچنا ہی مناسب ہے اور اس کی تمنا یا اسے مقصد بنانا غارت گرِ انسانیت ہے۔ ملاحظہ ہو:

(۱) یاعبد الرحمٰن لا تسأل الامارۃ فانک ان اوتیتہا عن مسألۃ وکلت الیہا وان اعطیتہا من غیر مسألۃ اعنت علیہا۔ (رواہ السنۃ الا مالکا عن عبد الرحمٰن بن سمرہ)

اے عبد الرحمان! کبھی امارت کی طلب نہ کرو کیونکہ اگر تمہیں مانگ کر امارت ملی تو نفس کے پھندوں میں آجاؤ گے اور اگر بے طلب مل جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری امداد ہوگی۔

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اور اس کے عہدے سے جہاں تک ممکن ہو گریز ہی کرنا چاہئے اور کبھی دل میں اس کی تمنا یا طلب نہ کرنی چاہئے۔ اگر حکومت کوئی اعلیٰ مقصد ہوتی تو اس کے حصول کی تو اور ترغیب دی جاتی نہ کہ اس سے روکا جاتا۔

(۲) ابو موسیٰ اشعری روایت کرتے ہیں کہ دو شخصوں نے حضورؐ سے عہدۂ امارت کی درخواست کی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ:

انا واللہ لا نولی ہذا العمل احدا سألہ او احدا احرص علیہ۔ (رواہ الشیخان و ابو داؤد والنسائی)

ہم کسی ایسے شخص کو اس عہدے پر مامور نہ کریں گے جو اس کی طلب یا تمنّا رکھتا ہو۔

ظاہر ہے اگر حکومت مطلوب و مقصود بننے کی چیز ہوتی تو اس کی تمنا یا طلب کو مذموم نہ قرار دیا جاتا۔

(۳) انکم ستحرصون علی الامارۃ وستکون ندامۃ یوم القیمۃ فنعمت المرضعۃ وبئست الفاطمۃ۔ (رواہ البخاری والنسائی عن ابی ہریرہ)

تم لوگوں میں عنقریب امارت کی حرص پیدا ہونے لگے گی لیکن بروز حشر سبب ندامت بنے گی۔ یہ دودھ پلانے والی ہے تو بڑی اچھی لیکن دودھ چھڑاتے وقت بڑی بُری ہوتی ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جس چیز کی تمنا حشر میں باعث ندامت و شرمندگی ہو وہ مقصود نہیں ہو سکتی۔

(۴) ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم ضرب علی منکبیہ (یعنی المقدام بن معدیکرب) ثم قال افلحت یا قدیم ان متّ ولم تکن امیرا ولا کاتبا ولا عریفا۔ (رواہ ابوداؤد عن المقدام بن معدیکرب)

آنحضرتؐ نے مقدام بن معدیکرب کے کاندھوں پر ہاتھ مارتے ہوئے فرمایا کہ اے قدیم! اگر کہیں کے امیر یا منشی (سکریٹری) یا چودہری بنے بغیر ہی مر جاؤ تو سمجھ لو کہ تم نے فلاح حاصل کر لی۔

اس حدیث سے صاف واضح ہوتا ہے کہ چھوٹی سی چھوٹی حکومت بھی مقصود نہیں ورنہ اس کے حاصل نہ ہونے پر فلاح کی بشارت نہ دی جاتی۔

(۵) من سأل القضاء وکل الی نفسہ ومن جبر علیہ ینزل علیہ ملک یسددہ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی عن انس)

جو شخص عہدۂ قضا کو مانگ کر حاصل کرے گا وہ اپنے نفس کے داؤ میں آجائے گا اور جسے مجبور کر کے یہ عہدہ سپرد کیا جائے گا اس پر ایک فرشتہ نازل کیا جائے گا جو اسے ٹھیک راہ پر لگاتا رہے گا۔

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی حکومت یا اس کا کوئی عہدہ مقصود بننے کے قابل نہیں ورنہ اس کی طلب و تمنا پر یہ تہدید کیوں ہوتی؟

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ احادیث یہ واضح کرنے کے لئے کافی ہیں کہ حکومت چھوٹی ہو یا بڑی مطلوب و مقصود نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف ایک مجبورانہ طریق کار ہے لہٰذا جہاں تک ممکن ہو اس سے گریز ہی کرنا چاہیئے۔ اور اگر یہ چیز خود بخود مجبورانہ حالت میں حاصل ہو جائے تو اس کا انداز یہ ہونا چاہیئے کہ ناگزیر حالات میں اصلاح معاشرہ کا کام لینے کے لئے کوئی خلا پُر کر دیا جائے اور پھر بھی زاویۂ نظر یہ ہو کہ معاشرے کی اخلاقی قوت کو بلند سے بلند تر کر دیا جائے اور اسی نسبت سے حکومت کا وجود کمزور کیا جاتا رہے تا آنکہ ایک دن حکومت کا وجود ہی ختم کر دیا جائے۔

حکومت کی صحیح پوزیشن یہ ہے کہ وہ ایک ایسی مکروہ شے ہے (اگر عادلانہ و صالح ہو) ورنہ ایسی حرام چیز ہے (اگر غیر عادلانہ ہو) جو صرف اضطراری کیفیت میں جائز ہو جاتی ہے۔ لب جان بھوکا اگر کوئی مکروہ یا حرام چیز اپنی جان بچانے کی غرض سے کھالے تو جائز ہے لیکن پھر بھی یہ شرط ہے اس میں چاہت اور رغبت نہ ہو کہ مزے لے لے کر کھائے بلکہ اندر سے

طبیعت میں تنفر ہونا ضروری ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ نہ استعمال کی جائے کہ جان تو بچ سکتی ہو پھٹا نک بھر میں اور کھالی جائے ڈیڑھ پاؤ۔ ان دو شرطوں کے ساتھ (جسے قرآن غیر باغ ولا عادٍ کہتا ہے) حرام شے کا استعمال بھی حالتِ اضطرار میں روا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ نادان کون ہوگا جو اس مجبورانہ جواز کا یہ مطلب سمجھے کہ یہ استعمالِ حرام بھی کوئی مقصدِ زندگی ہے؟

حکومت کا وجود اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ وہ معاشرے کی اخلاقی زندگی میں ایک اضطراری ضرورت پوری کرنے کا عارضی ذریعہ ہے۔ اوپر جتنی احادیث پیش کی گئی ہیں وہ اسی کی غمازی کرتی ہیں کہ حکومت کوئی ایسی مستحسن چیز نہیں جس کی تمنا یا کوشش کی جائے۔ خواہ کتنے ہی معصوم جذبے سے حکومت کی خواہش وسعی کی جائے لیکن ہوسِ اقتدار کی آمیزش اس میں ضرور ہوگی اور جاہ ومال کی آرزو ایک ایسا شیطانی جذبہ ہے جس کے متعلق حضورؐ نے فرمایا ہے کہ:

ماذئبان ضاریان فی حظیرۃ یأکلان ویفسدان باضرّ فیھا من حب الشرف وحب المال فی دین المرء المسلم۔ (رواہ البزار عن بن عمر)

دو خونخوار بھیڑیوں کا کسی زخم کو چاٹ چاٹ کر خراب کرنا زخم کے لئے اتنا مضر نہیں جتنی مضر ایک مسلمان کے دین کے لئے حبِ جاہ ومال ہے۔

پس اسلامی نقطۂ نظر سے حکومت اور اس کے جاہ واقتدار کو مقصد بنانا درست نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر ناگزیر طور پر اسے اختیار کرنا ہی پڑے تو طبیعت میں اندر سے وہی جذبۂ نفرت وحسرت ہونا چاہئے جو اضطرار میں حرام اشیاء کے استعمال سے ہونا ضروری ہے اور پھر اس کا استعمال اتنا کم سے کم ہونا چاہئے جس سے وہ اضطرار رفع ہو جائے۔ گویا غیر باغ ولا عاد کی شرط پوری کرنی ضروری ہے۔ پھر اسے ایک مجبورانہ حالت کا عارضی وعبوری مداوا ہی سمجھنا چاہئے نہ کہ مقصد۔

یہ صحیح ہے کہ اقتدار حکومت کے بغیر کام نہیں چلتا۔ لیکن یہ ایسا ہی ہے جیسے روپے کے بغیر کام نہیں چلتا لیکن کون یہ دعوےٰ کر سکتا ہے کہ روپیہ حاصل کرنا اسلام کا کوئی مقصد ہے۔ اپنی اور دوسروں کی ضروریات رفع کرنے کے لئے جتنا روپیہ (جائز طریقے سے) حاصل کیا جائے درست ہے لیکن اگر روپیہ ہی مقصود بن جائے تو اس سے جتنا بڑا دینی نقصان پیدا ہوگا اس کے ذکر سے اسلام کا سارا لٹریچر بھرا پڑا ہے۔ حکومت کو لوگ خاص اپنا مقصد قرار دیں تو ایک بات بھی ہے لیکن حکومت کو اسلام کا مقصد قرار دینا تو کسی طرح صحیح نہیں۔

مسلمانوں نے درمیان میں اسلام، قرآن، دین، اللہ، رسول وغیرہ کو رسمی واسطہ بنا کر جب حکومت کو مقصد قرار دیدیا تو رفتہ رفتہ تمام فرعونیت اندر گھس گئی۔ پھر یہ ہوا کہ اسلام تو نکل گیا اور صرف حکومت رہ گئی۔ اس کے بعد دین ومذہب کے نام پر حصولِ اقتدار کے لئے جو خانہ جنگیاں ہوئیں وہ مسلمانوں کی تاریخ کا بہت ہی افسوسناک باب ہے۔ اب آپ اپنے ملکِ پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک کو بغور دیکھئے۔ ہر اکھاڑ پچھاڑ، ہر جوتم پیزار، ہر جوڑ توڑ اور ہر جنگ وجدال میں صرف

ایک ہی چیز کارفرما نظر آئے گی اور وہ ہے ہوسِ اقتدار و حکومت۔ اس تمام سر پھٹول میں جو قیمتی وقت، توانائی اور روپیہ برباد ہوتا ہے۔ اگر اس کا دسواں حصہ بھی تعمیری کاموں میں صرف ہو تو یقین کیجئے اُمت کے بے شمار مسائل حل ہو جائیں اور معاشرہ درست ہو جائے۔ لیکن مقصد تو بن گیا ہے حصول حکومت و اقتدار، اور اسی کو اسلام کا مقصد قرار دے دیا گیا ہے اس لئے اصل مقصد تو پیچھے رہ گیا بلکہ تقریباً آٹے میں نمک کے برابر رہ گیا اور اس کی جگہ ہوسِ اقتدار نے لے لی یعنی نام تو رہا اسلام ہی کا اور کام رہ گیا قیامِ حکومت۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ دین سے قوت حاصل ہوتی ہے لیکن سمجھا گیا ہے کہ قوت سے دین حاصل ہوتا ہے جس دین کا مقصد قوت و اقتدار ہو اس کا حشر یہی ہوتا ہے کہ دین کی راہ سے آنے والی قوت اسی دین کو فنا کر دیتی ہے۔ لیکن اگر مقصود صرف دین ہو جو اصلاح معاشرہ کا دوسرا نام ہے تو حکومت ثانوی اور ناگزیر علت کی حیثیت سے آجائے جب بھی اور نہ آئے جب بھی دین اپنا کام کرتا رہتا ہے۔

اسلام کا نظریۂ اخلاق

مصنفہ محمد مظہر الدین صدیقی

ایک روپیہ بارہ آنے

قرآن اور علم جدید

مصنفہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین

قیمت پانچ روپے آٹھ آنے

فقہ عمرؓ

مصنفہ ابو یحییٰ امام خان

قیمت چار روپے

مقامِ سنت

مصنفہ مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی ندوی

قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ

منیجر ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور